بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات ختم ہو گئے ہیں اور وہ لوگ منتخب ہو چکے ہیں جنہیں انتخابی ادارہ کے ارکان کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور صدرِ مملکت کے انتخاب کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ مستقبل میں حالات کا دھارا کس رُخ بہنے والا ہے اس کے متعلق کوئی بات بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ ہم مالک الملک کے حضور میں دست بدعا ہیں کہ وہ اس ملک کے باشندوں، ان کے منتخب نمائندوں، اور اربابِ حکومت کو اخلاص، دیانت اور فہم وتدبر عطا کرے تاکہ وہ مل جُل کر ملت کو اُس راستہ پر ڈال دیں جس پر چل کر پاکستان کے وجود کے حقیقی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

جس روز سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے آمرانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اور پھر اپنے آئینی حدود سے صریح تجاوز کر کے بالآخر مجلسِ دستور ساز کو توڑا، وہ دن ملک کے لیے سب سے زیادہ منحوس تھا۔ اس کے بعد سیاست باز سرکاری افسروں کے مختصر سے گروہ کی دراز دستیاں بڑھتی چلی گئیں اور انہوں نے آئین وقوانین اور ساری جمہوری روایات کو نظر انداز کر کے ملک پر بے غل وغش آمریت مسلط کر دی۔ ان چند سالوں میں عوام کے شہری حقوق کو جس طرح پامال کیا گیا ہے یہ ایک بڑی دلفگار داستان ہے جسے اس ملک کا ہر فرد پوری طرح جانتا ہے۔ اس لیے ہم اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہم ان تازہ انتخابات کے بارے میں چند معروضات پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کے جائزے ہی سے اس صورتِ حال کا ٹھیک اندازہ کیا جاسکتا ہے

جس سے اس وقت ہمارا ملک دوچار ہے اور پھر ان حقائق کی روشنی ہی میں مستقبل کی تعمیر کے لیے کوئی صحیح لائحۂ عمل تیار ہو سکتا ہے۔

انتخابات کی غرض و غایت، جیسا کہ گزشتہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے، صرف یہی ہے کہ رائے عامہ اُبھر کر سامنے آئے اور پھر اسی رائے عامہ کو ملک میں بالادستی حاصل ہو جس سے قوم کے عزائم اُس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہو سکے۔ انتخابات اگر ایک طرف قوم کے ولولوں کے ترجمان ہیں تو دوسری طرف برسرِ اقتدار گروہ کی کارگزاریوں کا جائزہ بھی ہیں۔ ان سے جہاں عوامی رجحان کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حکمران طبقہ کی سابقہ کارگزاری کے بارے میں قوم کی عدالت سے کیا فیصلہ صادر ہوا ہے۔

جس طرح ایک سائنس دان ہمیشہ اپنے پیمانوں کی صحت برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی تحقیقات کے نتائج غلط نہ ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح دنیا کی ہر مہذب اور حقیقت پسند قوم اپنی رائے عام کو جانچنے اور پرکھنے کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حسّاس اور محتاط ہوتی ہے اور اس بات کا پورا التزام کرتی ہے کہ اُس کی رائے پوری صحت کے ساتھ ظاہر ہو تاکہ قومی فلاح و بہبود کے لیے اُسے جو نقشہ مرتب کرنا ہے اُس میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔ اگر ہوا کے رُخ کی نشاندہی کرنے والا آلہ ہی خارجی دباؤ کی وجہ سے کسی غلط سمت کی طرف اشارہ کر دے تو اس کی بنیاد پر جو قدم بھی اٹھایا جائے گا وہ لازماً غلط راستے پر لے جائے گا۔

اسی بنا پر ہر وہ قوم جو اپنے ہاں عدل و انصاف اور آئین و دستور کی حکمرانی چاہتی ہے وہ دو باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرتی ہے۔ ایک عدلیہ کی آزادی۔ دوسرے رائے عامہ کی آزادی جو درحقیقت پوری قوم کی عدالت ہے۔ قوم کی عدالت سے مہذب اقوام یہ فیصلہ

طلب کرتی ہیں کہ اُن کے اجتماعی نظم کو کونسے ہاتھ کن مقاصد کے حصول کے لیے کس قسم کے آئین و ضوابط کے تحت چلائیں عوام کی عدالت ان بنیادی امور کا فیصلہ کر دینے کے بعد برسرِ اقتدار گروہ کی سرگرمیوں کی ہر وقت جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے اور جہاں جہاں یہ سرگرمیاں اُسے قومی مفادات کے لیے ضرر رساں دکھائی دیتی ہیں، اُن پر گرفت کرتی ہے۔ حکومت اگر اپنے اختیارات اور ذرائع و وسائل سے کام لے کر کسی وقت عوام کی اس آزادیٔ انتخاب اور آزادیٔ تنقید میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے تو ایسی حالت میں ملکی عدالتیں آگے بڑھ کر لوگوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور ملک کے نظام کو جبر و استبداد کے راستے پر جانے سے روک دیتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کسی صحت مند معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے تین قسم کی آزادیاں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ عدلیہ کی آزادی، رائے عامہ کی آزادی اور رائے عامہ کی تربیت کرنے والے ذرائع و وسائل، یعنی تحریر و تقریر اور اجتماع کی آزادی۔ دنیا کی ہر ہوشمند قوم، جو خود اپنی دشمن نہ بن چکی ہو، ان تینوں اداروں کی اپنی جان پر کھیل کر بھی حفاظت و پاسبانی کرتی ہے کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک کی آزادی پر بھی دست درازی کی جائے تو پوری قوم پر انحطاط طاری ہو جاتا ہے۔

ان بنیادی امُور کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم بنیادی جمہوریتوں کے حالیہ انتخابات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں شدید مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ ان میں وہ تمام تدابیر استعمال کی گئیں جن سے انتخابات کے نتائج رائے عامہ کے بالکل برعکس رونما ہو سکیں، اور ان تمام ہتھکنڈوں سے کام لیا گیا جو رائے عام کے اظہار میں مانع ہو سکتے تھے۔

صحیح انتخاب کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لوگوں کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہو اور پریس اور پلیٹ فارم آزاد رہے تاکہ عوام کے سامنے ہر نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ آسکے اور وہ صحیح طریقہ سے رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن یہاں ستمبر کے تیسرے ہفتے تک تو یہ تمام

آزادیاں بالکل ہی مسلوب رہیں اور پورے زور شور کے ساتھ حکمران گروہ کا یک طرفہ پروپیگنڈا ہی ہوتا رہا۔ پھر ستمبر کے آخر میں کچھ تحریر و تقریر کی آزادی ملی بھی تو اس طرح کہ پریس اور خبر رساں ایجنسیوں پر حکومت کا شدید ضغط برقرار رہا اور مخالف نقطۂ نظر کو سرکاری پروپیگنڈا کے مقابلے میں عوام کے سامنے آنے کا بہت کم موقع دیا گیا۔

صحیح انتخابات کے لیے دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستیں ایمانداری کے ساتھ بالکل درست مرتب ہوں۔ لیکن اس معاملے میں محض کوتاہی نہیں بلکہ صریح بددیانتی سے کام لیا گیا اور ایسی ایسی دھاندلیاں کی گئیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ بااثر لوگوں نے جان بوجھ کر فہرستوں میں بے شمار فرضی ووٹروں کے نام درج کروالیے اور پولنگ کے موقع پر اس جعلسازی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان غلط ناموں کو فہرستوں سے خارج کرانے کی حتیٰ کوششیں بھی کی گئیں وہ زیادہ تر ناکام ہوئیں۔ دوسری طرف بے شمار اصلی ووٹروں کے نام درج نہیں کیے گئے، یا درج ہونے کے بعد قصداً کاٹ دیئے گئے، یا ان کے نام اور ولدیت وغیرہ لکھنے میں ایسی غلطیاں کی گئیں جن سے وہ مشتبہ ہو کر رہ گئے۔ ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے بھی جن لوگوں نے کوشش کی وہ اکثر و بیشتر ناکام ہی ہوئے۔ ان چابک دستیوں پر مزید ستم یہ تھا کہ بکثرت مقامات پر رائے دہندوں کی جو فہرست امیدوار کے پاس تھی وہ پولنگ آفیسر کی فہرست سے بہت کچھ مختلف تھی۔ فہرستوں کی ان خرابیوں پر پورا ملک چیختا رہا لیکن اربابِ اختیار ٹس سے مس نہ ہوئے اور آخر کار انتخابات انہی غلط اور ناقص فہرستوں کی بنیاد ہی پر منعقد کرالیے گئے۔

صحیح انتخاب کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ انتخابی حلقے بالکل فطری ہوں اور ان کی تشکیل میں کسی خاص فرد یا گروہ کے مفاد کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ لیکن حالیہ انتخابات کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب کی حد بندی میں بکثرت مقامات پر آبادی کی فطری وحدت کو

نظر انداز کر کے مخصوص امیدواروں کے مصالح کو بنیادی اہمیت دی گئی اور اس معاملے میں کسی ضابطہ یا کسی اصول کی پیروی نہیں کی گئی۔ حد یہ ہے کہ بعض مقامات پر تو ایک حلقۂ انتخاب سے متصل علاقوں کو خارج کر کے دُور دراز کے علاقے اس میں شامل کیے گئے تاکہ کوئی خاص امیدوار کامیاب ہو سکے۔ مختلف حلقوں کے ووٹروں کی تعداد میں کوئی تناسب نہ تھا۔ من مانی حد بندیوں کی وجہ سے کوئی حلقہ نو سو افراد پر مشتمل تھا تو دوسرے حلقے میں ووٹروں کی تعداد ڈھائی سو نفوس سے متجاوز نہ تھی۔

انتخابات کی اصل غرض اُسی صورت میں پوری ہوتی ہے جب عوام کو مقررہ مدت کے بعد کسی دباؤ، لالچ، تحریص یا تخویف کے بغیر ٹھیک اپنے ضمیر کے مطابق اظہار رائے کا موقع میسر آئے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اُسی شکل میں ممکن ہے جب لوگوں کے نزدیک ضمیر منڈی کا مال نہ بننے پاتے۔ لیکن اگر کوئی فرد یا گروہ انسانوں کو اپنے ضمیر کا سودا کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو وہ درحقیقت انسانیت کے خلاف ایک شرمناک سازش کرتا ہے۔ کسی انسان کے عزو شرف بلکہ اُس کی انسانیت کا دارومدار اُس کے ضمیر پر ہے۔ اگر اس کا ضمیر بیدار ہے تو وہ خوب و ناخوب کے درمیان تمیز کر سکتا ہے، حق کی حمایت پر کمربستہ اور باطل کے خلاف صف آرا ہو سکتا ہے، اور اس طرح اپنے ذاتی مفادات کو ملک و قوم، مذہب اور پُوری انسانیت کی بھلائی کے لیے قربان کرنے کا حوصلہ رکھ سکتا ہے۔ اسی ضمیر کی بیداری سے اُس کا دین، ایمان، اور اخلاق قائم ہے اور اگر یہ مردہ ہو جائے تو اس کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ دُنیا کی ہر عقلمند قوم جہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ عوام کے ضمیر کو زندہ رکھنے کا سامان کرتی ہے وہاں وہ مختلف اوقات میں پوری قوم کو ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جب اس کا ضمیر آزادی کے ساتھ فیصلے کر کے قوت و توانائی حاصل کر سکے۔ انتخاب اسی قسم کے قیمتی مواقع میں سے ایک نہایت زریں موقع ہے۔ اس میں عوام کو اس امر کی تربیت ملتی ہے کہ وہ کسی خوف، لالچ یا دباؤ کے بغیر ذاتی مفادات اور مصلحتوں کو یکسر نظرانداز

کرتے ہوئے محض اپنے ضمیر کی تحریک پر کوئی فیصلہ کریں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تازہ انتخابات میں عوام کو بہت بڑے پیمانے پر ضمیر فروشی کی تربیت دی گئی۔ ہزارہا روپے خرچ کر کے لوگوں سے ووٹ خریدے گئے اور خریدے ہوئے ووٹوں سے جیتنے والوں نے نہ صرف خود فخریہ اپنی کامیابیوں کا ڈھول پیٹا بلکہ قوم کے سرپرستوں نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر ان کو خوب شاباش دی۔ دوسری طرف ووٹ بیچنے والوں نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ کھلم کھلا اپنے ایمان و ضمیر کے سودے کیے اور کسی نے یہ محسوس تک نہ کیا کہ اپنے آپ کو بکاؤ مال بنا کر وہ کس ذلت کے گڑھے میں جا گرے ہیں۔

جن حضرات نے اپنی قوم کو ضمیر فروشی کی یہ تربیت دی ہے انہیں غور کرنا چاہیے کہ بے ضمیر افراد کا جو لشکر انہوں نے تیار کیا ہے وہ آخر ملک و ملت کے کس کام آسکتا ہے۔ انسان جب اپنے ایمان و ضمیر کا سودا کرنے پر ایک دفعہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کس کے ہاتھ اپنی متاع ایمان فروخت کر رہا ہے۔ اُسے جہاں سے بھی زیادہ قیمت وصول ہو گی وہ بے تکلف اسے بیچ ڈالے گا۔ آج جو لوگ آپ کے ہاتھ اپنے ضمیر بیچنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، آپ کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل وہ کسی دشمن کے ہاتھ اپنا ملک بیچ دینے پر تیار نہ ہو جائیں گے؟ جس بچے کو عہد طفولیت میں چھوٹی چھوٹی چیزیں چرانے کی عادت پڑ جائے اور ان چوریوں پر اُلٹی اس کی ہمت افزائی کی جاتی رہے، وہ ایک روز دھاڑی چور بن کر رہتا ہے۔ اس کا ڈاکو اور رہزن بن جانا نہیں بلکہ ایماندار بن کر اٹھنا خلاف توقع ہو گا۔

جو حضرات بنیادی جمہوریتوں کے ممبر منتخب ہونے کے لیے آگے بڑھے انہیں ملت کی تعمیرِ نو میں اساس اور بنیاد کا کام دینا ہے۔ اُن کی اصابت رائے پر قوم کے مستقبل کا دارو مدار ہے۔ اُن کے اخلاق کی مضبوطی سے قومی اخلاق کی پختگی وابستہ ہے۔ لیکن یہ بات شدید کرب و اضطراب کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ قوم کے ان بنیادی نمائندوں کی ایک بڑی تعداد نے

جس اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کی بہو بیٹیوں کو محض انتخاب میں کامیاب ہونے کے لیے ایسے ایسے ذلیل حربے استعمال کرنے کی تربیت دی جن کے تذکرے سے غیرت سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب ہم یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مرد کو اپنا شوہر کہہ سکتی ہے لیکن یہاں ہزاروں عورتوں نے دس دس غیر آدمیوں کو اپنا شوہر قرار دے کر ان کی بیوی کی حیثیت سے ووٹ ڈالے۔ کنواریوں نے بیگم فلاں بن کر ووٹ دیا۔ بیاہی ہوئی عورتوں نے اپنے شوہر کے سوا دوسروں کو اپنا شوہر بتایا۔ حد یہ ہے کہ بہنوں نے اپنے سگے بھائیوں کو اپنا شوہر قرار دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ اور یہ کام باپوں، بھائیوں، شوہروں اور بیٹوں کی بے علمی میں نہیں بلکہ ان کی رضامندی اور ان کے اپنے ایماء سے کیا گیا، کیونکہ کسی خاص امیدوار کے جیتنے سے ان کا مفاد وابستہ تھا۔ اسی طرح ہزارہا آدمیوں نے بے تکلف دوسروں کو اپنا باپ بتایا اور اس پر نہ خود انہیں کوئی شرم آئی نہ ان کے باپوں اور ان کی ماؤں کی غیرت میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ اس ذلّت کے گڑھے میں اپنی قوم کو اُن لوگوں نے جان بوجھ کر گرایا جو ہر قیمت پر انتخاب جیتنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ ہر جگہ فاحشہ عورتوں کی پوری پوری پلٹنیں پولنگ کے میدان میں اتاری گئیں جہاں انہوں نے جعلسازی میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے پُورا زور صرف کیا۔

پھر پیشہ ور غنڈے اور اسی طرح کے دوسرے سماج دشمن عناصر جو معاشرے کے لیے عذاب ہوتے ہیں اور جن کی شر انگیزیوں سے سوسائٹی کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس سرگرم عمل رہتی ہے، انہیں قوم کے ہیرو بنا کر سامنے لایا گیا اور ان کی سرپرستی اور پشت پناہی میں بہت سے من چلوں نے انتخاب لڑا۔ ان خدمات کے لیے ان کی نہ صرف پذیرائی ہوئی بلکہ انہیں مختلف شکلوں میں بیش بہا انعامات سے نوازا گیا۔ وہ لوگ جن کے نام پولیس کے رجسٹروں میں درج تھے انہیں اس "حسن کارکردگی" کے صلے میں معزز شہری کی اسناد عطا کی گئیں اور انہیں ایسے بلند مرتبہ

لوگوں کے ہاں باریابی نصیب ہوئی جنہیں اہلِ ملک نے بھاری بھرکم مشاہروں پر ان ناپسندیدہ عناصر کی بیخ کنی کے لیے متعین کر رکھا تھا۔ ان غنڈوں نے جو کارنامے انجام دیئے ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ انھوں نے مخالف امیدوار کو سرے سے پولنگ اسٹیشن میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ کہیں مخالف امیدوار کو یہ دھمکی دے کر مقابلے سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اسی وقت اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ کثیر التعداد مقامات پر انہوں نے سخت کشت و خون کیا۔ بہت سے مقامات پر شریف خواتین تک ان کی بدتمیزیوں سے نہ بچ سکیں اور یہ سب کچھ انھوں نے اس بھروسے پر کیا کہ نظم و نسق کی محافظ طاقت ان سے کوئی بازپرس نہ کرے گی۔ جو لوگ آج ان سماج دشمن عناصر کی خدمات سے مستفیض ہو رہے ہیں اس وقت انہیں اپنی اس غلط روش کا احساس نہ ہو، لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ ملک کے اندر ایک ایسی خوفناک آگ بھڑکانے کی حماقت کر رہے ہیں جس کی شعلہ فشانیاں نہ صرف ملک کے امن و امان کو غارت کر کے رکھ دیں گی بلکہ خود انہیں اپنے جان و مال کو ان کی لپیٹ سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ غنڈے کسی کی خدمت بھی بلا معاوضہ نہیں کرتے۔ ان سے خدمت لینے والوں کو لامحالہ انہیں ہر طرح کے جرائم کی چھوٹ دینی پڑے گی، اور یہ سودا لامحالہ اس ملک کے ہر باشندے کو بہت مہنگا پڑے گا۔ اس کی گراں قیمت ادا کرنے سے خود ان غنڈوں کے پرورش کرنے والے بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ خود نہیں تو ان کی آل اولاد کسی وقت اس کی قیمت ادا کرے گی۔ جو لوگ وقتی منفعتوں کے حصول کے لیے یا ان کے زیاں کے خوف سے اپنا دماغی توازن اس حد تک کھو بیٹھیں کہ انہیں اپنے کسی مذموم فعل کے خطرناک انجام کا ہوش نہ رہے، ان سے ملک اور اہلِ ملک کوئی اچھی توقعات وابستہ نہیں کر سکتے۔

آزاد انتخابات کے لیے دوسری شرائط کے علاوہ ایک ضروری اور اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس میں حکومت کی انتظامی مشینری بالکل غیر جانبدار رہے، کیونکہ اس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ

مداخلت رائے عامہ کو صحیح طور پر نمایاں ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر جمہوریت پسند قوم اس بات کا پُورا پُورا اہتمام کرتی ہے کہ اُس کے سرکاری ملازم انتخابات میں کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت نہ کریں، اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ سے ملک کے عوام جن لوگوں پر بھی اعتماد کر کے اقتدار کی باگیں سونپیں یہ ملازمین پُورے خلوص اور جذبۂ تعاون کے ساتھ ان کے ماتحت کام کریں۔ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے ان کو اس امر سے کوئی بحث نہ ہونی چاہیے کہ عوام ملک کا اقتدار کسے سونپیں اور کسے نہ سونپیں۔ یہ بات عملی طور پر ناممکن ہے کہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والا ہر گروہ عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی سول اور فوجی ملازمین کی نئی بھرتی شروع کر دے۔ اس لیے جمہوری حکومت کا معروف قاعدہ یہ ہے کہ ملازمین کو سیاسی دھڑے بندیوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے اور انہیں کسی مقام پر بھی ان میں ملوث نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ اگر آج ایک گروہ ان کی قوت وطاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے مخالفین کو نیچا دکھاتا ہے تو کل دوسرا گروہ بھی ان کی مدد سے اپنے مدِّمقابل کو کچلنے سے دریغ نہ کرے گا۔ جب ملازمین سے اس طرح کی ناجائز خدمات لی جائیں گی تو وہ بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے ایک پارٹی کی حیثیت سے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں گے اور بساطِ سیاست پر مختلف مُہروں کو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق چلانے لگیں گے۔ یہ صورتِ حال حکومت کے انتظام و انصرام کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے اور اس سے ساری انتظامی مشینری بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

دُنیا کے جمہُوری ممالک میں اس روایت کا حکومت کے سربراہوں اور ملازموں دونوں کی طرف سے جس طرح احترام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ امریکہ کے حالیہ انتخابات کے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ صدر جانسن انتخابات سے پہلے اس امر کے لیے بے حد کوشاں تھے کہ وہ اپنے معاشی منصوبوں کے بارے میں ماہرینِ معاشیات کی رائے معلوم کریں۔ یہ ذہن نشین

رہے کہ یہ مشیر صدر جانسن کے لیے کوئی اجنبی نہ تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو ان کے ساتھ حکومت کے عہدہ دار کی حیثیت سے کئی برس سے شریک کار رہے۔ ایک دن ان سب کو جانسن نے اپنے ایک رفیق کار کی وساطت سے ایک پارٹی میں مدعو کیا۔ وہاں حکومت کی کارگزاریوں پر قریب قریب ایک گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی اور ان ماہرین معیشت نے ان کے بعض پہلوؤں کو محتاط الفاظ میں سراہا۔ صدر جانسن نے جب یہ محسوس کیا کہ ان معیشت دانوں کی دیانتدارانہ رائے ان کے حق میں ہے تو ان کے دل میں بالکل فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس رائے کی نشر و اشاعت کا کوئی انتظام کریں۔ چنانچہ اخباری نمائندوں کو فوراً اطلاع کی گئی اور وہ معیشت دانوں کے گرد استفسار کی غرض سے جمع ہو گئے۔ ان حضرات کو صدر جانسن کی اس حرکت سے سخت کوفت ہوئی۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ انہیں صدر اپنی انتخابی مہم میں بطور آلۂ کار استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ بے حد برہم ہوئے اور انھوں نے اخباری نمائندوں کے سامنے حکومت کے معاشی منصوبوں کی تعریف کرنے کی بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو ابھارنا شروع کر دیا۔ صدر جانسن نے جس مقصد کے تحت یہ ساری کارروائی کی تھی اُس میں انہیں سخت ناکامی ہوئی اور انہیں بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان اٹھانا پڑا۔ (ٹائم، امریکہ ۲۸ اگست ۱۹۶۴ء)

جناب محمد ایوب خاں صاحب خود بھی اصولی اعتبار سے ملازمین حکومت کے سیاست سے الگ تھلگ رہنے کے قائل ہیں۔ یہاں ہم ان کی ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کی نشری تقریر کے وہ الفاظ نقل کرتے ہیں جو انھوں نے فوجی افسروں اور سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہے تھے:

"سیاست سے الگ رہو . . . تم کو پارٹیوں کی سیاست میں عملی حصہ لینے اور کسی نقطۂ نظر کو پھیلانے سے قطعی پرہیز کرنا چاہیے . . . ہم پاکستان کے ملازم ہیں اور اسی حیثیت سے ہم اس پارٹی کے ملازم ہیں جس کو لوگ برسر اقتدار لائیں۔"

کتنا صحیح ہے یہ نظریہ اور کتنا صائب ہے یہ مشورہ! لیکن ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نظریہ کے پُرجوش مبلغین کے ہاتھوں عمل کی دنیا میں اس کی جس قدر تذلیل ہوئی ہے وہ جمہوریت کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ سب سے پہلے پولیس کے ذریعہ امیدواروں کے رجحانات کا کھوج لگایا گیا اور جب اس امر کا پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ انتخاب میں حصہ لینے والا ایک گروہ برسرِ اقتدار طبقہ کا دل و جان سے خیر خواہ اور وفادار ہے تو پھر اُسے کامیاب بنانے کے لیے کھلے بندوں ہر قسم کی جعلسازیاں کی گئیں۔ ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ اِن میں سے جو ذرا با اثر تھے انہیں مختلف قسم کی رشوتیں دی گئیں۔ اور اگر انہیں رام نہ کیا جا سکا تو پھر اُن پر مختلف قسم کے مقدمات بنا دیئے گئے۔

اس کے بعد پولنگ کے موقع پر سرکاری ملازمین کے سامنے جس قسم کی دھاندلیاں کی گئیں اور انہوں نے محض برسرِ اقتدار طبقہ کی خوشنودی کی خاطر ان سے جس طرح اغماض برتا اُس نے عوام کے اعتماد کو شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ جعلی ووٹ علانیہ بھگتائے گئے اور اصلی ووٹرو کی قطاریں بے بسی کے ساتھ کھڑی دیکھتی رہیں کہ ان کے نام سے کرائے کے آدمی ووٹ ڈال رہے ہیں۔ اِس بُرائی کے خلاف ہر احتجاج بے کار گیا اور کسی نے اسے نہ روکا۔ پولنگ اسٹیشنوں پر علانیہ غنڈہ گردی ہوئی اور پولیس تماشائی بنی دیکھتی رہی۔ پریزائڈنگ افسروں نے بعض جگہ خود جعلی ووٹوں کی پرچیاں بکسوں میں ڈالیں۔ جہاں سرکاری افسروں نے انتخابات میں غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی وہاں فوری طور پر ان کے تبادلے کیے گئے اور دوسرا عملہ مقرر کر دیا گیا تاکہ برسرِ اقتدار پارٹی کو دھاندلیاں کرنے میں سہولت ہو۔ امیدواروں اور ان کے ایجنٹوں کو دھکے مار مار کر پولنگ اسٹیشنوں سے نکال دیا گیا اور بعض جگہ انہیں سرے سے اندر گھسنے ہی نہیں دیا گیا۔ جعلی ووٹروں کو پکڑ کر حکام کے حوالہ کیا گیا مگر وہ چھوڑ دیئے گئے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بےشمار واقعات کسی گہری تلاش اور جستجو کے بعد منظرِ عام پر نہیں لائے گئے بلکہ یہ وہ عام واقعات ہیں جن سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں اور جنہیں ہر دیکھنے والی آنکھ نے خود

مشاہدہ کیا ہے۔ آخر ہمارے ملک میں کونسا ایسا شخص ہے جس کے سامنے غنڈوں کی چیرہ دستیاں اور پولیس کا تغافل نہ آیا ہو۔ ملک کی عظیم اکثریت اس افسوسناک حقیقت پر شاہد ہے کہ سماج دشمن عناصر بے بس ووٹروں کو ڈراتے دھمکاتے اور مارتے پیٹتے رہے لیکن پولیس، جو مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر امن قائم کرنے کے لیے متعین کی گئی تھی، بے بسوں کی کوئی دستگیری کرنے سے قاصر رہی۔ شر پسند عناصر من مانی کارروائیاں کر رہے تھے اور امن کے محافظوں نے غیر متعلق تماشائی بنا کر ان المناک مناظر کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔ سوائے ان مقامات کے جہاں پوری آبادی متحد ہو کر کسی شریف آدمی کو کامیاب کرانے میں دلچسپی لے رہی تھی، باقی حلقوں میں شیطنت کو ستمرانی کے لیے بالکل کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ پولیس اگر کہیں حرکت میں آئی بھی تو وہ دھاندلی اور خرابی کو روکنے کے لیے نہیں بلکہ ان خرابیوں کے سدباب کی کوششوں کو غیر مؤثر اور ناکام بنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوتی۔ چنانچہ پولیس اور انتظامیہ کے اس افسوسناک تغافل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان انتخابات میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔

جان و مال، عزت و آبرو کا یہ زیاں بڑا المناک ہے اور اس کے اثرات سے ملک کی پوری اجتماعی زندگی کا متاثر ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ جب انتظامیہ کی زیرِ نگرانی دھاندلی اور حیلسازی کی جائے تو عوام کا جمہوریت پر اعتماد بالکل متزلزل ہو جاتا ہے۔ شریف اور نیک نفس شہری انتخاب سے پناہ مانگتے ہیں اور اس بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ یہ کام خدا ترس اور باضمیر لوگوں کو زیب نہیں دیتا بلکہ یہ غنڈوں یا غنڈوں کی سرپرستی کرنے والوں ہی کے لیے موزوں ہے۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ اگر کسی ملک میں شرفا عوام کی نمائندگی سے دستکش ہونے لگیں اور ان کے اجتناب اور عدمِ دلچسپی کی وجہ سے یہ ذمہ داری ملک کے اخلاق باختہ اور بے ضمیر لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے تو وہ ملک بربادی کے کسی خطرناک طوفان سے کیوں دوچار نہ ہو گا؟

انتخابات کے بارے میں یہ احساس لوگوں کو جمہوریت سے سخت مایوس بلکہ متنفر اور بدظن کر دیتا ہے اور اُن کے دل و دماغ میں آہستہ آہستہ یہ خیال راسخ ہونے لگتا ہے کہ یہاں جائز آئینی راستوں سے اقتدار میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ یہ رجحان بڑا خطرناک ہے اور ہر ہوشمند اور امن پسند شہری کو اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ یہ احساس کبھی کسی معقول اور صحت مند تحریک کی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ آتش فشاں پہاڑ بن کر پھٹتا ہے جس سے صرف ایک ملک کا امن ہی غارت نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت کو شدید اخلاقی جھٹکے لگتے ہیں۔

فی الحقیقت صدرِ مملکت محمد ایوب خاں صاحب کے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت ہے۔ یہ اُن کے اخلاص اور عزم کی آزمائش ہے۔ یہ اُن کے فہم و تدبّر کی آزمائش ہے۔ آج اگر قوم کسی دباؤ کے بغیر اپنی آزاد مرضی سے عنانِ اقتدار اُن کے ہاتھ میں سونپ دے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ وہ بڑی خوشی کے ساتھ قوم کے اس اعتماد کو قبول فرمائیں۔ لیکن اگر عوام ان کے بجائے کسی دوسری شخصیت پر اپنے اعتماد کا اظہار کریں تو اُن کے لیے معقول اور صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ عوام کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ ان کے اس اقدام سے ملک کے اندر جمہوریت کو تقویت حاصل ہوگی اور جمہوری روایات کے نشو و نما کے لیے ایک صحت مند فضا پیدا ہوگی۔

ملک و ملت کی خدمت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص لازمی طور پر برسرِ اقتدار ہی ہو۔ یہ خدمت حزبِ اختلاف کے اندر رہ کر بھی سرانجام دی جاسکتی ہے۔ صدر صاحب کے دورِ اقتدار کے کارنامے پورے ملک کے سامنے ہیں۔ اگر عوام ان سے مطمئن نہ ہوں اور ان کے خلاف فیصلہ کر دیں تو ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خونی انقلاب کے خدشات بیان کرنے کے بجائے ایک مؤثر حزبِ اختلاف کی تشکیل کریں اور ان سارے فرائض کو ایمانداری

جرأت اور اخلاص کے ساتھ سرانجام دیں جو کسی جمہوری ملک میں حزبِ اختلاف پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ اُن کی ایک عظیم خدمت ہو گی جس سے آنے والی نسلیں رہنمائی حاصل کریں گی۔

ملک کی انتظامیہ، عدلیہ اور رائے عامہ اگر مضبوط ہوں تو حکومت کی تبدیلی سے نہ تو ملک کا وقار کم ہوتا ہے اور نہ اس کی قوت وطاقت میں کسی لحاظ سے کوئی کمی آتی ہے۔ فرانس سے زیادہ کس ملک میں حکومت کرنے والے ہاتھ مسلسل اور سرعت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ لیکن ان پیہم تبدیلیوں سے فرانس کو کسی طرح کا کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہاں کے سول اور فوجی ملازمین نے رائے عامہ کا ہمیشہ احترام کیا اور جس گروہ کو بھی عوام نے قومی مفاد کے پیش نظر اقتدار کی باگیں سونپیں۔ ملازمینِ حکومت نے پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی اور جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے انہیں پوری نیک نیتی کے ساتھ سرانجام دیا۔

اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم ملک کی فلاح وبہبود کے لیے اپنے کچھ نظریات رکھتا ہو تو وہ استعفا دے کر سیاست کے میدان میں آئے۔ اُسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قوت کے بل بوتے پر اپنے نظریات لوگوں پر مسلط کرے۔ اُس کے لیے صحیح اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ ملازمت سے الگ ہو کر اپنے دلپسند افکار ونظریات کا عوام میں پرچار کرے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے جمہوری طریق سے اقتدار کے تخت پر متمکن ہو۔ پھر عوام کے معتمد نمائندے کی حیثیت سے اپنے ارادوں کی تکمیل کرنا اس کا حق ہے۔ لیکن یہ چیز تو ابتدائی ضابطۂ اخلاق کے بھی منافی ہے کہ کسی سرکاری ملازم کو جو اختیارات ملک کے انتظام وانصرام کے لیے تفویض کیے گئے ہیں انہیں وہ اپنے دلپسند نظریات کے تسلط کے لیے استعمال کرنا شروع کر دے۔

اس کا یہ فعل دستور، آئین، عقل اور اخلاق کسی نقطۂ نظر سے بھی صحیح اور درست نہیں ہو سکتا۔

"خونی انقلاب" کی بات سامنے آگئی ہے تو اس سلسلے میں بھی ہم صدرِ مملکت کی خدمت میں پورے خلوص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ اس وقت جبکہ مسندِ اقتدار کے بارے میں فیصلہ کُن مرحلہ درپیش ہے، اُن کا یہ ارشاد کہ "اگر عوام کے فیصلے کے نتیجے میں اقتدار اپوزیشن کی طرف منتقل ہو گیا تو ملک میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہو جائے گا جو اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی طرح نرم اور پُر امن نہ ہو گا"، کسی اعتبار سے بھی اُن کے شایانِ شان نہیں۔ اُنھوں نے بلاشبہ اس امر کا یقین دلایا ہے کہ اس متوقع انقلاب کے لانے والے وہ خود نہ ہوں گے لیکن اُن کا یہ ارشاد اس مرحلہ پر بڑا معنی خیز ہے اور اسے دھمکی کے سوا اور کسی مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا۔ اس سے اُن کی برہمی اور رنجیدگی کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ عوامی فیصلے کو قبول تو کر لیں گے لیکن خوش دلی کے ساتھ نہیں بلکہ تردّد اور ناراضگی کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے دل میں رائے عامہ کی وہ قدر و منزلت نہیں جو ایک جمہوریت پسند فائز کے دل میں ہونی چاہیے۔

صدرِ محترم کے اس بیان پر مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی نے جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے ایک حصے کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

"صدرِ محترم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپوزیشن کے لوگ سیاسی لیڈروں کے اس انجام سے سبق لیں جو دوسرے ملکوں میں فوجی انقلابات کے بعد ہوا ہے۔ میں اُن کے اس ارشاد کی تائید کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس کے ساتھ فوجی انقلاب کرنے والے بھی اس انجام سے سبق سیکھیں جو جنوبی امریکہ، جنوبی ویت نام، عراق، شام وغیرہ ممالک کے انقلابی ڈکٹیٹروں نے دیکھا ہے، اور جس سے ابھی چند روز پہلے سوڈان کے جنرل عبود صاحب کو سابقہ پیش آیا ہے۔ صدر صاحب نے ملک

(باقی ص۱۴۴ پر)

(بقیہ اشارات)

میں جس انقلاب کے برپا ہونے کا اندیشہ ظاہر فرمایا ہے اس کے متعلق میں پوری صفائی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ یہ ملک پے در پے انقلاب کے خطرے سے اُس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک یہاں لوگوں کو اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے منتخب کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا، اور جب تک یہاں کے سرکاری ملازمین، فوجی اور سول دونوں یہ سبق نہیں سیکھتے کہ حکومت کرنا عوام کے اپنے چنے ہوئے نمائندوں کا حق ہے اور ملازمین کا کام یہ ہے کہ جو پارٹی بھی عوام کی مرضی سے برسرِ اقتدار آئے وہ ایمانداری کے ساتھ اس کے ماتحت اپنے فرائض انجام دیں۔ یہ سبق جب تک نہ سیکھا جائے گا، اور جب تک برسرِ اقتدار لوگ سرکاری ملازمین کو انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے، اور جب تک اونچے درجے کے سرکاری افسروں کو یہ اصرار رہے گا کہ حکومت لازماً ان کی اپنی مرضی ہی کی بننی چاہیے، اس وقت تک ہمارے اس بدقسمت ملک میں انقلابی طوفان آتے رہیں گے"۔

خواتین کا تعمیری جریدہ — مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی — چھوٹے بچوں کا پیارا رسالہ

ماہنامہ بتول لاہور — اسلام کے نظامِ حیات پر — پندرہ روزہ "نور" لاہور

مستند کتب

نیز آپ کے بچوں اور لڑکیوں کیلیے ہماری اور اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ اور دیگر اداروں کی ہر قسم کی جملہ مطبوعات ہم سے طلب فرمائیے

پتہ

ادارۂ بتول - ۴ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور